بینش فاطمہ

لیکچرار اردو، وفاقی اردو یونی ورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی اسلام آباد

اسلامی فنِ تعمیر سے جدید فنِ تعمیر تک کی داستان:

"آثارالصنادید" کے تناظر میں

Beenish Fatima

Lecturer Urdu, Federal Urdu University Of Arts, Science & Technology,Islamabad.

The Story From Islamic Architecture to Modern Architecture:
In context of ‘‘Aasaar.us.Sanadeed’’

In 1847, the Muslim educationist Sir Sayyed Ahmad Khan (1817-1898) published an Urdu text entitled Aaasar-us-Sanadeed, listing and describing all notable buildings and monuments of Delhi. His work so impressed British scholars in Delhi that he was invited to join the Royal Asiatic Society and to write a second, improved edition intended for translation into English. Unfortunately, the translation was never written. Aaasar-us-Sanadeed was nonetheless a landmark text in the field of Indo-Islamic architectural history. Sir Sayyed was one of many local Indian scholars producing architectural and archaeological histories of the Subcontinent in the nineteenth-century. Yet their names are generally unknown and their research lost in obscurity.Early twentieth-century western scholarship paid them little attention and an image formed which saw decades that this belief has been contested nineteenthcentury historiography only serving an Orientalist vision of Indian art and archaeology. This article represents an outlook, describing major monuments of Delhi architecture as examined by Sir Sayyed Ahmad Khan in the mid nineteenth-Century.

سر سید احمد خان محض ایک شخص کا نام نہیں بلکہ ایک عہد اور ایک تحریک کا نام ہے۔ایک ایسا عہد اور ایک ایسی تحریک جس نے زوال کے اندھیروں میں بھٹکتے مسلمانوں کو نہ صرف روشن راہوں سے ہمکنار کیا بلکہ انہیں ان کی کھوئی ہوئی حیثیت واپس دلوانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔انہوں نے نہ صرف باریک بینی سے مسلمانوں کے زوال کے اسباب کا جائزہ لیا بلکہ ان کے تدارک کے لیے ہر ممکن جدوجہد بھی کی۔ان کی جدوجہد کا میدان خاصا وقیع ہے۔ان کی تمام تر کاوشوں پر نظر ڈالی جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تمام تر عمر چومکھی لڑتے گزری۔سید احمد خان سے سر سید احمد خان تک کا سفر انہوں نے جس خاص خوبی کے سہارے طے کیا وہ ان کی سچائی اور دلیری تھی۔سر سید احمد خاں کے کارناموں'ان کی ادبی کاوشوں اور تمام تر زندگی کے تمام معاملات پر نظر ڈالیں تو ہر ہر مرحلے پر وہ حق اور سچ کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول:

''سچائی کی تلاش اور تکمیل زندگی (ترقی) یہ دو اہم بنیادیں ہیں'جن پر سر سید کے تمام علمی کاموں کی بنیاد کھڑی ہے۔یہی علی گڑھ کی علمی تحریک کی روح ہے۔یہ وہ 'سائنٹفک نقطہ نظر' ہے جس کے پیدا کرنے کا سہرا علی گڑھ تحریک اور اس کے نامور بانی سر سید کے سر ہے۔(۱)

سر سید احمد خان جن میدانوں میں سرگرمِ عمل رہے ان میں سے ایک ادب اور تحقیق کا میدان بھی ہے۔سر سید احمد خان نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور اس کے ذریعے فرسودہ روایات، مسلمانوں کے زوال آمادہ مزاج، اور ان کی رگوں میں سرایت کر جانے والی دیگر معاشرتی، سماجی اور مذہبی کمزوریوں اور خامیوں کا کمال مہارت سے خاتمہ کرتے چلے گئے۔انہوں نے اپنے عہد کے غالب رجحان کے مطابق اپنی ادبی و قلمی زندگی کا آغاز مذہبی موضوعات کو سپردِ قلم کرنے سے کیا۔مولانا حالی نے سر سید کی تصنیفی زندگی کے تین دور مقرر کئے ہیں:

''پہلا دور۔شروع سے لیکر ۱۸۵۷ء تک

دوسرا دور۔۱۸۵۷ء سے سفر انگلستان (۱۸۶۹ء) تک

تیسرا دور۔سفر انگلستان سے وفات (۱۸۹۸ء) تک''۔(۲)

ان ادوار میں سر سید نے مذہب اور تاریخ پر قلم فرسائی کی اور اپنی تمام تر تحریروں کی بنیاد تحقیق پر رکھی۔اگر سر سید کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی تمام تر زندگی حقائق کی تلاش اور ان کے بیان مین سرگرداں ملتی ہے۔سر سید کا سب سے بلند پایہ تحقیقی کارنامہ 'آثار الصنادید' ہے۔بنیادی طور پر اس کا موضوع تاریخ ہے اور اس کتاب میں سر سید نے دلی کی قدیم عمارات کا احوال بیان کیا ہے۔''آثار الصنادید'' جو آثار و عمارات پر ایک

عظیم کتاب ہے، ان کی تحقیقی شغف کا ثبوت مہیا کرتی ہے (۳)۔ سرسید ''آثار الصنادید'' لکھنے کی طرف کیوں متوجہ ہوئے، مختلف محققین نے اس کے بارے میں مختلف آرائوں کا اظہار کیا ہے۔ حالی نے اس کی وجہ خرچ کی تنگی بتائی ہے۔ ''سرسید ابتداء سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے، خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے لہٰذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سید الاخبار جو ان کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا، کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا'' (۴)۔

سرسید سخت کوش انسان تھے اور انہوں نے ہمیشہ اپنے لئے مشکل میدانوں کا انتخاب کیا۔ ویسے بھی وہ تاریخ میں خالص دلچسپی رکھتے تھے۔ سرسید کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو بیدار کرنا تھا اور اس کے لیے انہوں نے ایک ماہر سپہ سالار کی طرح مختلف حربے اختیار کئے۔ ان میں سے ایک حربہ ''تاریخ'' کا استعمال تھا، مذہب کے بعد ان کا دوسرا بڑا تصنیفی میدان تاریخ تھا۔ سرسید نے اس کتاب کی تکمیل کیلئے ڈیڑھ سال تک محنت کی، انہوں نے قریباً دو سو کے قریب دلی کی قدیم عمارات پر تحقیق کی۔ ان کے دوست مولانا امام بخش صہبائی نے ان کا قدم قدم پر ساتھ دیا اور ہر طرح سے مدد بہم پہنچائی۔

مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''عمارتوں کی تحقیقات نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ برابر جاری رہی۔ سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کیلئے شہر کے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی ہوتے تھے۔ باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا، بیسویں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہو گئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہو گئے تھے اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے، ان سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اس سے کیا مقصود تھا۔ کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے، ان کا مفصل حال دریافت کرنے کیلئے تاریخوں کی طرف رجوع کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہو گئی تھی کہ ان کی ماہیئت معلوم کرنی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طول اور ارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورت حال قلمبند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے اور ہر

ایک کتبے کو بعینہٖ اس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھچوانا اور اس طرح کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ بر آ ہونا فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا"(۵)

سر سید نے جو اتنی محنت کی، اس کا مقصد محض معاش کا حصول نہ تھا بلکہ وہ دلی جو کہ مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کا مرکز تھی اور وہاں کی قدیم عمارات مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار تھیں اور ان کا قیمتی سرمایہ تھیں، سر سید اس سرمائے اور ورثے کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو سرسری طور پر ہی قدیم عمارتوں کا جائزہ لے کر ایک کتاب تیار کر لیتے لیکن انہوں نے تو ایک ایک کتبے کے رسم الخط کو پڑھنے کیلئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالے رکھی۔ سر سید خود کہتے تھے:

"قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے، ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندوالیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا"۔(۶)

آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں مکتبہ نول کشور سے شائع ہوا۔ بعنوان کاتمہ اس پر تاریخ صنفہ ۱۲۶۳ درج ہے۔ اس کی منظوم تقریظ نواب جناب محمد ضیاء الدین خان بہادر نے تحریر کی۔ پہلا ایڈیشن چھ سو صفحات پر مشتمل تھا اور سر سید نے اسے چار ابواب میں تقسیم کیا تھا اور ہر باب کے علیحدہ علیحدہ صفحات درج کئے تھے۔ پہلے ایڈیشن میں ابواب کی تقسیم کچھ یوں تھی۔

باب پہلا۔ شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال مین۔

باب دوسرا۔ قلعہ معلٰی کی عمارتون کے حال مین۔

باب تیسرا۔ خالص شہر شاہجہان آباد کے حال مین۔

باب چوتھا۔ دلی اور دلی کے لوگون کے حال مین۔(۷)

اس میں دلی کی کل ۱۲۸ قدیم عمارات کے خاکے ہیں جنہیں دو مصوروں فیض علی خاں اور مرزا شاہ رُخ نے بنایا تھا۔ سر سید نے اپنی یہ محققانہ کاوش "تھیا فلس طامس مٹکاف" کے نام معنون کی تھی اور مقدمے میں مٹکاف کی مدح بھی کی ہے۔ اس کے پہلے باب میں سر سید نے ۳۰ عمارات کا احوال بیان کیا ہے۔ اس حصے میں بیرون شہر کی عمارات کا ذکر کیا ہے اور بیشتر کے کتبے اور نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں کل ۳۲ عمارتوں کا حال

بیان کیا ہے۔ اس میں لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں خاص طور پر شہر شاہجان آباد کی عمارتوں کا ذکر ہے اور فصیل کے اندر کی کل ۷۰ عمارتوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ چوتھے باب میں سرسید نے اپنے عہد کی دلی کے ۱۱۹ نامور لوگوں کا ذکر کیا ہے اور اس باب کے آغاز میں دلی کی آب و ہوا' زبان وغیرہ کو زیر بحث لائے ہیں۔ سرسید کا یہ کارنامہ اپنی نوعیت کا منفرد کارنامہ تھا۔ اس سے قبل اس پائے کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ ''آثار الصنادید'' سرسید کا پہلا باقاعدہ تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر محمود الٰہی اپنے مضمون ''اردو میں جدید تحقیق کا آغاز'' میں لکھتے ہیں:

''پہلے ایڈیشن نے اردو تحقیق کو ایک نیا موضوع دیا مگر اس میں نئے آدابِ تحقیق کے واضح نشانات نہیں ملتے۔ اس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ سرسید نے اس کی تصنیف کے پیچھے کتنے ہفت خواں طے کئے ہوں گے اور کتنا خونِ جگر صرف کیا ہو گا مگر حق بات یہ ہے کہ وہ تحقیق جدید کے مبادیات تک نہ پہنچ سکے۔ اس میں نہ تو روایت کو درایت کی کسوٹی پر پرکھنے کا رجحان ملتا ہے اور نہ استدلالی طریقہ کار اپنانے کا میلان پایا جاتا ہے۔ یہ ایڈیشن مآخذ کے حوالے اور ان کی نقاہت کی چھان بین سے بھی خالی ہے''۔(۸)

وجہ یہ ہے کہ سرسید احمد خان کے اندر محنت کا جذبہ تو موجود تھا، ان کا ذہن تاریخ لکھنے کی طرف مائل تھا۔ وہ حق اور سچ کے متلاشی تھے لیکن تحقیق کے باقاعدہ اصول و ضوابط سے زیادہ آشنا نہ تھے۔ ویسے بھی سرسید نے جب ''آثار الصنادید'' لکھی تو ان کی عمر قریباً ۲۹۔۳۰ برس تھی۔ ابھی ان کا ذوق تحقیق نمو تو پا رہا تھا لیکن پختہ نہ ہوا تھا۔ دوسرے ان کے سامنے اس سے قبل اردو میں تحقیق کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا اور نہ ہی ابھی مغرب کے تحقیق کے اصولوں اور اندازِ فکر تک ان کی رسائی ہوئی تھی اسی لئے اس ایڈیشن میں تحقیقی اندازِ فکر مفقود ہے لیکن اس سب کے باوجود اس کتاب کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس عہد کی اہم شخصیات نواب ضیاء الدین ببر' رخشاں' مرزا غالب اور امام بخش صہبائی نے اس کی تقریظیں لکھیں جو کہ اس ایڈیشن کے آغاز میں شامل کی گئیں۔

انگریزوں نے سرسید کے اس کارنامے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اسی زمانہ میں مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجان آباد ولایت جاتے تھے، وہ ایک نسخہ آثار الصنادید کا ساتھ لے گئے اور وہاں جا کر اس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبران سوسائٹی نے اس کو بہت پسند کیا اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کے بعض ممبران نے مسٹر رابرٹس کو کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ جب مسٹر رابرٹس ولایت

سے واپس آئے تو انہوں نے سر سید کی شرکت سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا۔ اس وقت سر سید کو یہ خیال ہوا کہ جو کسریں پہلے ایڈیشن میں رہ گئی ہیں، ان کی درستی اور اصلاح کی جائے(۹)۔

اس خیال کے بعد سر سید نے ''آثار الصنادید'' میں ترمیم و تنسیخ کی منصوبہ بندی شروع کر دی اس کیلئے انہوں نے از سر نو محنت کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں انہیں ایڈورڈ تھامس کی مدد اور مشاورت بھی حاصل رہی۔ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''ان کو پرانی چیزوں کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا، انہی کے کہنے سے سر سید نے آثار الصنادید کو از سر نو مرتب کیا تھا''۔(۱۰)

خلیق انجم ''آثار الصنادید'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''دوسرے ایڈیشن کا پہلا ٹائٹل انگریزی اور دوسرا اردو میں ہے، اس طرح ایک پیش لفظ انگریزی میں (دو صفحے) اور ایک اردو میں (پانچ صفحے) شامل ہے اس کے ساتھ ہی قطب مینار پر انگریزی میں ایک نوٹ ہے' یہ غالباً وہی نوٹ ہے جو سر سید نے آرکیالوجی سوسائٹی آف انڈیا کے جلسے میں پڑھا تھا۔ اس ایڈیشن کو زیادہ سائنٹیفک بنانے کے لئے سر سید نے کافی ترمیم و تنسیخ کی اور بہت سے اضافے کئے۔ کتاب کی ترتیب بھی بالکل بدل دی۔ یہ ایڈیشن دلی کے مطبع سلطانی سے ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا''۔(۱۱)

دوسرے ایڈیشن کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود الٰہی اپنے مضمون ''اردو میں جدید تحقیق کا آغاز'' میں لکھتے ہیں:

''آثار الصنادید'' کا دوسرا ایڈیشن مغربی آداب تحقیق کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی نہ صرف زبان بدلی ہوئی ہے بلکہ مطالب و مشملات میں اچھا خاصا فرق ملتا ہے۔ اس کی ترتیب و تہذیب' تحقیق کے ایک نئے نقطہ نظر کی آئینہ دار ہے۔ اس اڈیشن کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس سے وہ ساری باتیں نکال دی گئی ہیں جن پر داستانی رنگ غالب تھا اور جو ہر طرح محتاج ثبوت تھیں۔ پہلے ایڈیشن کا اندازِ بیان جذباتی اور داستانی تھا، دوسرے ایڈیشن کا مورخانہ اور محققانہ ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا، اس کی کوشش کی کہ اپنے پڑھنے والوں کو اپنی معلومات کے ذرائع اور ماخذ بھی بتائیں''۔(۱۲)

سر سید احمد خان نے پہلے ایڈیشن میں کافی کانٹ چھانٹ کی اور یوں پہلا ایڈیشن جو کہ چھ سو صفحات پر مشتمل تھا، صرف دو سو چوراسی صفحات کے اختصار کے ساتھ دوسرے ایڈشن کی شکل میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس

طرح دوسرے ایڈیشن میں کل ۳۱۶ صفحات کم ہوئے۔ یقیناً پہلے ایڈیشن میں سرسید نے تمام تر مواد انتھک محنت اور کوشش سے جمع کیا تھا لیکن یہ امر ان کی محققانہ دیانتداری کا ان مٹ ثبوت ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے جو مواد اضافی 'زائد یا غیر ضروری خیال کیا، اسے نکال دیا اور اس میں ذرا برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ اس طرح انہوں نے مقدار کے بجائے معیار کو تحقیق کا اصول بنایا۔ دوسرا ایڈیشن بنیادی طور پر تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب کل ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے' پہلے باب کا عنوان ہے ''دہلی کی عمل داریوں کے مختصر حالات میں''۔

سرسید احمد خان نے 'آثار الصنادید' کا یہ باب انتہائی محنت سے لکھا اس کیلئے بے شمار کتب کا مطالعہ کیا۔ ہندوستان کی اصل تاریخ تک رسائی حاصل کرنے کیلئے تاریخ فرشتہ، تاریخ ابو الفدا، مہابھارت، آئین اکبری، خلاصتہ التواریخ و راجاولی، تاج الماثر، توزکِ جہانگیری، اکبر نامہ، پوتھی اندر پرست مہاتم، نزہت القلوب، مراتِ آفتاب نما کا مطالعہ کیا اور اپنے ان ماخذات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس باب کے آغاز سے ہی نہ صرف سرسید کی محققانہ بصیرت کا معترف ہونا پڑتا ہے بلکہ اسلوب و بیان کی سادگی بھی قاری کی توجہ فوراً حاصل کر لیتی ہے۔ اس باب کے آخر میں سرسید نے دوسرے باب کی فہرست شامل کر دی ہے۔ دوسرے باب کا عنوان ہے: ''دہلی میں قلعوں کے بننے اور شہروں کے آباد ہونے کے بیان میں''۔ اس حصہ میں سرسید نے اندر پرستھ میں راجا جدہشٹر سے لے کر شاہجان کے لال قلعے تک قریباً انیس قلعوں کی تعمیرات کا ذکر کیا ہے اور شہروں کے آباد ہونے کا احوال بیان کیا ہے' یہ باب کل ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

تیسرا باب اس کتاب کا سب سے طویل باب ہے۔ اس کے کل صفحات کی تعداد ۱۰۸ ہے جو کہ بعنوان ''بادشاہوں اور امیروں کی متفرق بنائی ہوئی عمارتوں کے بیان میں'' قائم کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں دلی کی مختلف عمارتوں کا تفصیلی حال بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اردو زبان کے بارے میں سرسید نے تحقیق کی ہے کہ یہ زبان کس طرح وجود میں آئی اور اس کے رائج ہونے کی کیا وجوہات تھیں۔ اس کا عنوان ہے ''خاتمہ اردو زبان کے نکلنے اور مروج ہونے کے بیان میں''۔ اس کے آخری حصہ کا عنوان ہے ''تتمہ کتب جات مکاناتِ کہنہ میں'' اس حصہ میں عمارتوں کے کتبے درج ہیں۔ سرسید نے ایک ایک کتبے کے پڑھنے کیلئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالے رکھی۔

آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشنل ۱۸۴۷ء جبکہ دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے درمیان آٹھ سال کا درمیانی فرق ہے اور پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ سرسید احمد خان نے دوسرے ایڈیشن کے پیش لفظ میں خود ہی اس فرق کو تفصیلاً بیان کر دیا ہے جس سے تحقیق میں ان کی پیشرفت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور محققانہ اندازِ فکر میں ہونے والی تبدیلی سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

"۱۔ اس کتاب کا پہلا باب جس میں مختصر ہندوستان کی آبادی اور پرانی اور نئی عملداریوں کا ذکر ہے، پہلی کتاب میں نہ تھا۔

۲۔ پہلی کتاب کے دوسرے باب میں صرف شاہجہان آباد کے قلعے کا ذکر تھا، اس کتاب کے دوسرے باب میں اس قلعے کا بھی پہلی کتاب سے بہتر بیان ہے اور علاوہ اس کے ابتدائے آبادی سے آج تک جس قدر قلعے اور شہر بسے، ان سب کا بھی ذکر ہے۔

۳۔ پہلی کتاب کے پہلے اور تیسرے باب میں جس قدر مطالب تھے' وہ سب اس کتاب کے تیسرے باب میں اکٹھے ہیں بلکہ بعضے پرانے مکانات کا اور حال جو دریافت ہوا ہے، وہ زیادہ ہے۔

۴۔ پہلی کتاب میں دو نقص تھے، ایک یہ کہ بعض پرانے مکانات کا اصلی حال دریافت نہ ہوا تھا، دوسرے یہ کہ پہلی کتاب میں بعض جگہ بیان حالات میں کچھ غلطی ہو گئی تھی، اس کتاب میں یہ دونوں نقص دُور کئے گئے۔

۵۔ پہلی کتاب میں عمارات کا بیان متفرق اور غیر منتظم تھا۔ اب کی دفعہ سب عمارات کا حال بہ ترتیب سال بنا انتظام سے لکھا گیا۔

۶۔ پہلی کتاب میں جو حال بیان کیا گیا تھا، اس کی سند نہ تھی، اب کی کتاب میں جو حال لکھا گیا ہے، اکثر اس کی سند کے لئے نام اس کتابِ تاریخ کا جس سے وہ حال لکھا گیا، حاشیے پر مندرج ہے۔

۷۔ بڑی عمدہ بات اس حال کی کتاب میں یہ ہے کہ جس قدر کتبے پرانی عمارتوں پر ہیں، وہ سب اصلی قطع اور اصلی خط کے مطابق اس کتاب میں مندرج ہیں"۔(۱۳)

پیش لفظ میں سرسید احمد خان نے "آثار الصنادید" کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے فرق کی وضاحت کیلئے جو نکات پیش کئے ہیں، یہ محض دونوں ایڈیشنوں کے فرق کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ انھی کی بنیاد پر مستقبل میں تحقیق کی عمارت کھڑی ہوتی نظر آتی ہے۔ اس میں سرسید نے تحقیق کے اصول بڑی مہارت سے بیان کر دیئے ہیں۔

یہی وہ اصول ہیں جن پر چل کر آنے والے محققین نے تحقیق کے قصر تعمیر کیے۔ یہ محض نکات نہیں بلکہ تحقیق کے سنگ میل ہیں۔ خاص طور سے چوتھے نکتے میں انہوں نے تحقیق کے دو اصول بیان کر دیئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کے دو نقص یہ قرار دیئے ہیں کہ پہلے ایڈیشن میں ”مکانات کا اصلی حال“ دریافت نہ ہوا تھا۔ دوم یہ کہ ”بیان حالات میں“ کچھ غلطی ہوگئی تھی یعنی محقق کے لئے لازم ہے کہ وہ نہ صرف حالات بلکہ اصلی حالات دریافت کرنے کی کوشش کرے اور اگر وہ اپنی تحقیق کیلئے ”اصلی حال“ دریافت نہیں کرپاتا تو وہ تحقیقی فن پارے کا نقص گردانا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے اپنے دوسرے ایڈیشن میں اس نقص کو دُور کرنے کی نہ صرف حتی الامکان کوشش کی بلکہ اس کا اعتراف بھی کیا کہ پہلے ایڈیشن میں وہ مکانات کے اصلی حالات دریافت کرنے سے قاصر رہے تھے۔ اگر وہ اپنی اس غلطی کا اعتراف نہ بھی کرتے تو جو حالات انہوں نے پہلے ایڈیشن میں دیئے تھے وہ آنے والے محققین کے لئے بہت حد تک قابل قبول ہی ہوتے لیکن سرسید نے دیانتداری سے کام لیتے ہوئے دوبارہ محنت کر کے اس نقص کو دُور کیا۔ دوم انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ بعض جگہ ”بیان حالات“ میں کچھ غلطی ہو گئی تھی، جسے انہوں نے دوسرے ایڈیشن میں درست کر دیا یعنی حالات کے بیان میں بھی محقق کیلئے لازم ہے کہ وہ انتہائی حزم و احتیاط سے کام لے کیونکہ اگر وہ اصل حالات دریافت کر لیتا ہے تو یہیں اس کی تحقیق کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کیلئے لازم ہے کہ وہ ان کے بیان میں بھی دیانتداری سے کام لے۔

اسی طرح سرسید نے تحقیق کے ایک اور اصول کی نشاندہی کی ہے کہ پہلے حصہ میں ”عمارات کا بیان متفرق اور غیر منتظم“ تھا لیکن بہت جلد ان کو احساس ہو گیا کہ تحقیق میں ترتیب اور تنظیم بھی انتہائی ضروری ہے اور اس کیلئے انہوں نے 'زمانی' ترتیب کا انتخاب کیا اور دوسرے ایڈیشن میں عمارات کے بیان کیلئے اس ترتیب کا اہتمام کیا جس ترتیب سے وہ عمارات وجود میں آئی تھیں۔

تحقیق میں سند اور ماخذات کی اہمیت مسلم ہے۔ ”آثار الصنادید“ کے پہلے ایڈیشن میں سرسید نے جو حال بیان کیا ”اس کی سند نہ تھی“، لیکن کچھ ہی عرصہ میں سرسید کو احساس ہو گیا کہ سند کے بغیر کوئی بھی تحقیقی کارنامہ قابل قدر اور قابل قبول نہیں ہو سکتا اسی لئے دوسرے ایڈیشن میں سرسید نے حاشیے میں اس کتابِ تاریخ کو بھی درج کیا ہے جس سے وہ حال لیا گیا ہے۔

انتھک محنت اور جانفشانی سر سید احمد کی شخصیت کا خاصا تھی۔ انہوں نے زندگی میں جو کام بھی کیا انتہائی لگن اور دیانتداری سے انجام دیا۔ اسی طرح انہوں نے جو کتابیں تحریر کیں، نہ صرف ان کا مواد بہت محنت سے جمع کیا بلکہ اپنی بات کو ہمیشہ دلائل کے ساتھ پیش کیا جو کہ تحقیق کا ایک بنیادی اصول ہے اور یہی اصول ہمیں ''آثار الصنادید'' میں بھی کار فرما نظر آتا ہے۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کے لئے سرسید نے تاریخ لکھنے کیلئے اصل ماخذات اور حقائق تک پہنچنے کی حتی الامکان کوشش کی اور اس کیلئے اپنے عہد کے اہم ماخذات تک رسائی حاصل کرنے کیلئے کوشاں رہے۔ انہوں نے جن کتب سے استفادہ کیا' ان کے ماخذات نہ صرف حاشیے میں درج کئے بلکہ پیش لفظ میں ان کتب کی فہرست بھی دی جن کی مدد سے ''آثار الصنادید'' ترتیب دی گئی جو کہ درج ذیل ہیں:

''توریت مقدس، راجائولی، خلاتہ التواریخ، سلسلۃ الملوک، مہابھارت، بھاگوت، آئین اکبری، جغرافیہ، تاج المآثر، تاریخ فرشتہ، توزکِ جہانگیری، اکبرنامہ، پوتھی اندر پرست مہاتم، مرآتِ آفتاب نما، نزہتہ القلوب، جواہر الحروف، لب التواریخ، نہ سپہر، تاریخ ہدایت اللہ خاں، تاریخ فیروز شاہی، ضیابرنی، توزکِ تیموری، ابطال ضرورت، خزائن الفتوح یعنی تاریخ علائی، تاریخ شیخ عبد الحق، فتوحات فیروز شاہی، اخبارُ الاخیار، تاریخ فیروز شاہی، شمس سراج عفیف، ظفرنامہ تیموری، شاہ جہاں نامہ، کتاب آرکیولجیکل سوسائٹی بنگال نمبر ۷،۶،۴،۳ کتاب رویل اسیاٹک سوسائٹی نمبر ۶، ہفت اقلیم، تاریخ کشمیر، پوتھی ہائی بھاٹ، تقویم البلدان، قصیدۂ ہمزیہ مآثر الامرا، مآثر عالمگیری، زیچ محمد شاہی، مارکدی پوان، ابوالفدا''۔(۱۴)

یہ قریباً ۴۱ کتب ہیں اور ان میں چند کتب ہندوئوں کی لکھی ہوئی ان کی تاریخ کے متعلق ہیں جبکہ زیادہ تر مسلمان مؤرخین کی کتب ہیں۔ سرسید نے ''آثار الصنادید'' کے دوسرے ایڈیشن میں جس محققانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے، اس پر مغرب کے اندازِ تحقیق کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی اپنے مضمون ''آزادی سے قبل اردو تحقیق'' میں ان اثرات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''دوسرا ایڈیشن زیادہ بہتر شکل میں تحقیق کے طریقہ کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذرائع معلومات، ماخذ اور اشاریہ کے التزام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۵۴ء تک سرسید مغربی آدابِ تحقیق سے واقف ہو چکے تھے''۔(۱۵)

دونوں ایڈیشنوں میں پائے جانے والے فرق اور مغربی اثرات کے بارے میں ڈاکٹر محمود الٰہی اپنے مضمون ''اردو میں جدید تحقیق کا آغاز'' میں لکھتے ہیں:

''پہلا ایڈیشن تاریخی اور موضوعاتی ترتیب کے لحاظ سے ناقص تھا، دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے یہ نقص دُور کیا اور ہر بات کا اشاریہ قائم کیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سرسید مغربی آداب تحقیق سے واقف ہو چکے تھے اور یہ سمجھ گئے تھے کہ مواد کو کس طرح مرتب کرنا چاہئے''۔(۱۶)

بیشتر محققین کے خیال میں دوسرے ایڈیشن میں سرسید کا محققانہ اندازِ فکر' مغرب کے اثرات کا نتیجہ ہے اور اس کی وجہ یہی بتائی گئی ہے کہ سرسید احمد خان کا انگریزوں کے ساتھ نہ صرف عام میل جول تھا بلکہ وہ ان کے علم و فن اور ادب پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھے الطاف حسین حالی نے ''حیات جاوید'' میں ''آثار الصنادید'' کے دوسرے ایڈیشن میں اسلوب کی تبدیلی کو خوشگوار تبدیلی قرار دے کر جہاں اس کا تذکرہ کیا ہے وہاں مغرب سے استفادہ کا اشارہ بھی کیا ہے۔ حالی ''حیاتِ جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''بڑی خوبی اس نئے ایڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے ایڈیشن کے نہایت سادگی ہے اور اس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات باردہ سے بالکل پاک ہے''۔(۱۷)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ حالی کے خیال میں پہلے ایڈیشن میں ایشیائی اثرات کے تحت کسی حد تک مبالغہ آرائی اور تکلفات ملتے ہیں لیکن دوسرے ایڈیشن کا اسلوب اس ''ایشیائی اثر'' سے پاک ہے گویا اب وہ مغربی اندازِ بیان لئے ہوئے ہے۔

سرسید نے دوسرے ایڈیشن میں تمام تر غلطیاں دُور کرنے کی پوری کوشش کی اور سرسید احمد خاں کی اس تحقیقی کاوش کو اپنوں اور غیروں کی طرف سے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس دور میں ''آثار الصنادید'' سے قبل کوئی خاص تحقیقی کاوش نہیں ملتی اور سرسید نے جس محنت' دیانتداری اور خلوص کے ساتھ اس کتاب میں تحقیق کے تقاضے پورے کئے، تحقیق کے اصول متعارف کروائے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سرسید کی زندگی میں ہی اس کتاب کے مختلف زبانوں میں تراجم کا بھی آغاز ہو گیا۔''ایم۔ گارساں دتاسی نے اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا۔ ۱۸۸۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے سید احمد کو ہندوستانی آثار کی تحقیق کے اعتراف کے طور پر فیلو منتخب کیا۔''(۱۸)

مولانا شبلی نعمانی اپنے مقالے ''سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر'' میں سرسید احمد خان کے اس تحقیقی کارنامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چونکہ حقائق اور واقعات کی طرف ابتداء سے میلان تھا، اس نے دلی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت و کوشش سے اس کام کو انجام دیا"۔(۱۹)

مولانا حالی نے سرسید کے اس تحقیقی کارنامے کو ان کی آئندہ ترقیات کا پہلا زینہ قرار دیا ہے اور اس کی مثال ایک شعر سے دی ہے۔

"سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت بالکل ابو تمام کے اس شعر کے مصداق تھی:

وَیَصعَدُ حَتّٰی یَظُنُّ الوَرٰی

بِاَنَّ لَہٗ حَاجَۃً فِی السَّمَآئِ

"یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو آسمان پر کچھ کام ہے"۔(۲۰)

"آثار الصنادید" کے بعد اردو تحقیق کیلئے ایک راستے کا تعین ہو گیا۔ سرسید احمد خان کے رفقائ، ان کے ہم عصروں اور بعد میں آنے والے محققین نے نہ صرف سرسید کی اس محققانہ کاوش سے استفادہ کیا بلکہ ہر دور میں اسے سنگ میل کی حیثیت بھی حاصل رہی اور یہ کتاب محققین سے تحسین و آفرین بھی حاصل کرتی رہی کیونکہ آثار الصنادید سرسید کا زندہ تحقیقی کارنامہ ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ سرسید نے اپنے عہد میں پہلی بار اس کتاب کے ذریعے محققانہ اندازِ فکر کو نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ تحقیق کے اصول بھی متعارف کرائے اور اس کے ساتھ ساتھ تحقیق کیلئے ایک خاص اسلوبِ بیان کی بنیاد بھی رکھی۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ سید، سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، طبع سوم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴، ص ۵۷۔

۲۔ ایضاً ، ص ۷،۶۔

۳۔ ایضاً ، ص ۲۶۴۔

۴۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیاتِ جاوید، لاہو، ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، ۱۹۸۴، ص ۵۳۔

۵۔ ایضاً ً، ص ۵۴۔

۶۔ ایضاً ً، ص ۵۵۔

۷۔ جوادالدولہ سید احمد خان، آثار الصنادید، دارالخلافہ شاہجہان آباد، مطبع نول کشور، ۱۲۶۳ھ، ص ۹۔

۸۔ سلطانہ بخش، ایم، ڈاکٹر، مرتب، اردو میں اصول تحقیق، طبع چہارم، ج ۲، اسلام آباد، ورڈویژن پبلشرز، ۲۰۰۱، ص ۶۳۔

۹۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیاتِ جاوید، ص ۵۶۔

۱۰۔ ایضاً ً، ص ۵۷۔

۱۱۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، مرتب، آثار الصنادید، ج ا، نئی دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۰، ص مقدمہ۔

۱۲۔ سلطانہ بخش، ایم، ڈاکٹر، مرتب، اردو میں اصول تحقیق، طبع چہارم، ج ۲، ص ۶۴۔

۱۳۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، مرتب، آثار الصنادید، ج ا، ص مقدمہ۔

۱۴۔ ایضاً ً

۱۵۔ ابن کنول، پروفیسر، مرتب، تحقیق و تدوین، دہلی، کاک آفسیٹ پرنٹرس، ۲۰۰۶، ص ۲۶۷۔

۱۶۔ سلطانہ بخش، ایم، ڈاکٹر، مرتب، اردو میں اصول تحقیق، طبع چہارم، ج ۲، ص ۶۴۔

۱۷۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیاتِ جاوید، ص ۵۷۔

۱۸۔ اصغر عباس، مترجم، خلیق نظامی، جدید ہندوستان کے معمار: سید احمد خان، انڈیا، ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، ۱۹۷۱، ص ۱۰۷۔

۱۹۔ اردو اکیڈمی سندھ، مرتب، انتخاب مقالاتِ شبلی، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰، ص ۳۷۔

۲۰۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیاتِ جاوید، ص ۶۶۔